کھڑے دیکھ کر مارے لحاظ کے ادھر نہ جا سکا۔

وکیل صاحب نے اسے دیکھتے ہی ہاتھ بڑھا دیا اور بولے۔ ''آؤ رما بابو کہو تمہارے میونسپل بورڈ کی کیا خبریں ہیں؟''

رما نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔''

وکیل: ''آپ کے بورڈ میں لڑکیوں کی لازمی تعلیم کی قرارداد کب پاس ہوگی؟ اور کئی بورڈوں نے تو پاس کر دیا۔ جب تک عورتوں کی تعلیم کا رواج نہ ہوگا، ملکی ترقی غیر ممکن ہے۔ آپ تو یورپ نہ گئے ہوں گے۔ واہ کیا آزادی ہے، کیا دولت ہے۔ کیا زندگی ہے۔ کیا جوش ہے۔ بس معلوم ہوتا ہے کہ یہی جنت ہے اور عورتیں بھی سچ مچ دیویاں ہیں۔ اتنی خوش مزاج، اتنی آزاد۔ یہ سب عورتوں کی تعلیم کی برکت ہے۔''

رما نے اخباروں میں ان ملکوں کا تھوڑا بہت حال پڑھا تھا۔ اسی اعتبار سے بولا۔ ''وہاں عورتوں کے اطوار تو بہت اچھے نہیں ہیں۔''

وکیل: ''نان سینس! اپنے اپنے ملک کا رواج ہے۔ آپ ایک حسینہ کو کسی کے ساتھ تنہا دیکھ کر دانتوں میں انگلی دباتے ہیں۔ ہم اتنے بدگمان ہو گئے ہیں کہ عورت اور مرد کو یکجا دیکھ کر شبہ کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے، لیکن جہاں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتی ہیں، وہاں جنسی اختلاط کا وجود نہیں رہتا۔ آپس میں شوق اور دلچسپی کی اتنی باتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ جنسیت کے لیے بہت تھوڑی گنجائش رہ جاتی ہے۔ یہ سمجھ لیجیے کہ جس ملک میں عورتوں کو جتنی ہی آزادی حاصل ہے، وہ ملک اتنا ہی مہذب ہے۔''

عورتوں کو قید میں یا پردہ میں یا مردوں سے کوسوں دور رکھنے کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ آپ کے یہاں لوگ اتنے بداطوار ہیں کہ عورتوں کی توہین کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتے۔ نوجوانوں کے لیے فلکیات، مذہب، فنون لطیفہ، ادبیات، فلسفہ، تاریخ، نظریات اور ہزاروں ہی ایسے مضامین ہیں، جن کی بنا پر آپس میں گہرے تعلقات پیدا ہو سکتے ہیں۔ میں سال بھر امریکہ اور یورپ میں رہ چکا ہوں۔ کتنی ہی عورتوں کے ساتھ میرا ربط ضبط تھا۔ ان کے ساتھ سیریں کی ہیں۔ مباحثے کیے ہیں، لیکن کسی نوجوان کو ایسے چرچے کرتے نہیں سنا جس پر کوئی عورت شرم سے سر جھکائے اور پھر اچھے اور برے کہاں نہیں ہوتے۔"

رما کو اس وقت اس موضوع میں کوئی لطف نہ آیا۔ وہ تو دوسری ہی فکر میں پریشان تھا، مگر وکیل صاحب کی طبیعت روانی پر تھی۔ پھر بولے:

"جب تک ہم مردوں اور عورتوں کو آزادی کے ساتھ ساتھ اپنی ذہنی نشوونما نہ کرنے دیں گے، ہم زوال کی طرف گرتے جائیں گے۔

بندشوں سے سماج کا پیر نہ باندھیے، اس کے گلے میں قیدیوں کی زنجیر نہ ڈالیے۔ بیواؤں کی شادی کیجیے۔ خوب زوروں سے، لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب کوئی ادھیڑ عمر آدمی کسی جوان عورت سے شادی کرتا ہے تو کیوں اتنا کہرام مچ جاتا ہے؟ یورپ میں اسی اسی سال کے بوڑھے جوان عورتوں سے شادی کرتے ہیں۔ ستر سال کی بوڑھیاں جوان مردوں سے شادی کرتی ہیں، کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

ہم بوڑھوں کو موت آنے سے پہلے ہی مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ انسان کو

اگر کبھی رفیق کی ضرورت ہوتی ہے، تو بڑھاپے میں۔ جب اسے ہمیشہ کسی دستگیر کی خواہش ہوتی ہے۔ جب وہ دوسروں کا دست نگر ہو جاتا ہے۔''

رما کا دھیان جھولے کی طرف تھا۔ کسی طرح رتن سے دو دو باتیں کرنے کا موقع ملے۔ اس وقت اسے یہی دھن لگی ہوئی تھی، مگر اس کا وہاں جانا آداب مجلس کے خلاف تھا۔ آخر اس نے وکیل صاحب سے پوچھا۔ ''آج اتنے لڑکے یہاں کیسے آ گئے؟''

وکیل صاحب نے محبت آمیز لہجہ میں کہا۔ ''اجی کچھ نہ پوچھئے، رتن بائی کو بچوں سے بڑی محبت ہے۔ نہ جانے کہاں سے اتنے لڑکے جمع ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ کو جھولے سے کچھ شوق ہے تو جائیے۔''

رما تو یہ چاہتا ہی تھا۔ چٹ پٹ جھولے کے پاس جا پہنچا۔ رتن اسے دیکھ کر مسکرائی اور بولی:

''ان شیطانوں نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ جھولے سے ان کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ آیئے ذرا آپ بھی بیگار کیجیے۔ میں تو تھک گئی۔''

یہ کہہ کر وہ پکے چبوترے پر بیٹھ گئی۔ رما جھولے دینے لگا۔ بچوں نے نیا آدمی دیکھا تو سب کے سب اپنی باری کے لیے بے قرار ہو گئے۔ رتن کے ہاتھوں دو باریاں آ چکی تھیں، مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ کچھ لڑکے تو تیسری بار جھولیں اور باقی بیٹھے منہ تاکتے رہیں۔ دو اترے تو چار بیٹھے۔ رما کو بچوں سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔ مگر اس وقت پھنس گیا تھا۔ کیا کرتا۔

آخر آدھ گھنٹہ کی بیگار کے بعد اس کا جی اوب گیا۔ گھڑی میں ساڑھے نو بج

رہے تھے۔ مطلب کی بات کیسے چھیڑے۔ رتن تو جھولے میں اتنی مگن تھی گویا اسے روپوؤں کی یاد نہیں ہے۔ یکا یک اس نے رما سے کہا:

''بابو جی، میں جھولے پر بیٹھتی ہوں آپ مجھے جھلایئے۔ مگر نیچے سے نہیں، جھولے پر کھڑے ہوکر پینگ ماریئے۔''

رما بچپن ہی سے جھولے پر بیٹھتے ڈرتا تھا۔ ایک بار دوستوں نے زبردستی جھولے پر آنے کے لیے مجبور کر دیا، مگر اپنی مجبوری کا اظہار کیونکر کرتا۔ رتن دو بچوں کو لے کر بیٹھ گئی اور یہ گیت گانے لگی:

کدم کی ڈریاں جھولا پڑ گیوری
رادھا رانی جھولن آئی

رما جھولے پر کھڑا ہوکر پینگ مارنے لگا، لیکن اس کے پاؤں کانپ رہے تھے اور دل بیٹھا جاتا تھا۔ جب جھولا اوپر سے گرتا تھا تو اسے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی رقیق شے اس کے سینے کے اندر چبھتی چلی جا رہی ہے اور رتن بچوں کے ساتھ گا رہی تھی۔

کدم کی ڈریاں جھولا پڑ گیوری

ایک لمحہ کے بعد رتن نے کہا۔ ''ذرا اوپر بڑھایئے صاحب۔ آپ سے تو جھولا اوپر بڑھتا ہی نہیں۔''

رما نے شرمندہ ہوکر اور زور لگایا، مگر جھولا نہ بڑھا۔ رما کے سر میں چکر آنے لگا۔

رتن: ''آپ کو پینگ مارنا نہیں آتا۔ کبھی جھولا نہیں جھولے؟''

رما نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، ادھر تو برسوں سے نہیں جھولا۔''

رتن: ''تو آپ بچوں کو سنبھال کر بیٹھئے۔ میں آپ کو جھلاؤں گی۔ اگر جھولا اس ڈال کو نہ چھولے تو کہیے گا۔''

رما کی روح فنا ہوگئی۔ بولا۔ ''آج بہت دیر ہو رہی ہے، پھر کبھی آؤں گا۔''

رتن: ''ابھی کیا دیر ہوگئی ہے، دس بھی تو نہیں بجے۔ گھبرائیے نہیں۔ ابھی بہت رات پڑی ہے۔ خوب جھول کر جائیے گا۔ کل جالپا دیوی کو بھی لائیے گا۔ ہم دونوں جھولیں گے۔''

رما جھولے پر سے اتر آیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ سر میں ایسا چکر آ رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اب گرا، اب گرا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا سائیکل کی طرف چلا اور اس پر بیٹھ کر بھاگا۔

کچھ دور تک اسے ہوش نہ رہا۔ پاؤں آپ ہی آپ پیڈل گھماتے جاتے تھے۔ آدھی دور جانے کے بعد اسے ہوش آیا۔ اس نے سائیکل گھما دی۔ کچھ دور چلا پھر اتر کر سوچنے لگا، اب کیا کرے۔ آج ملاحظہ میں پڑ کر اس نے کتنا چرکا کھایا۔ کیوں اس کے منہ سے آواز نہیں نکلی۔ رتن کوئی ہوا تو تھی نہیں، جو اسے کھا جاتی۔

دفعتاً اسے یاد آیا، اس تھیلی میں آٹھ سو روپے تھے، شاید رتن نے روپے گنے نہیں۔ ورنہ ضرور ذکر کرتی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تھیلی کسی کو دے دے یا اسے اور روپوؤں کے ساتھ ملا دے، پھر تو غضب ہی ہو جائے۔ کہیں کا نہ رہوں گا، کیوں نہ اسی وقت چل کر بیشی روپیہ مانگ لاؤں، لیکن اب تو دیر بہت ہوگئی۔ سویرے پھر

آنا پڑے گا۔

اس نے پھر سوچا۔ اگر یہ دو سو روپے مل بھی گئے پھر بھی تو پانچ سو روپوؤں کی کمی رہے گی۔ اس کا کیا انتظام ہوگا۔ اب تو ایشور ہی بیڑا پار لگائے تو لگے گا۔ صبح تک کوئی انتظام نہ ہو سکا تو مصیبت کا سامنا ہوگا۔

زندگی میں ایسے موقعے بھی آتے ہیں جب مایوسی میں بھی ہمارا رشتۂ امید نہیں ٹوٹتا۔

رما نے سوچا، ایک بار پھر گنگو کے پاس چلوں۔ اس کے ہاتھ پاؤں پڑوں۔ ممکن ہے اسے کچھ رحم آ جائے۔ وہ فوراً صرافہ جا پہنچا، مگر گنگو کی دکان بند تھی۔ وہ پیچھے پھرا ہی تھا کہ چرن داس آتا ہوا نظر آیا۔ رما کو دیکھتے ہی بولا: ''بابو جی! آپ نے تو ادھر کا راستہ ہی چھوڑ دیا۔ کہیے روپے کب ملیں گے؟''

رما نے عاجزی سے کہا۔ ''اب بہت جلد ملے جاتے ہیں۔ دیر نہیں ہے۔''

''گنگو نے ہوشیاری سے روپے وصول نہ کر لیے ہوتے تو ہماری طرح بیٹھے ٹاپتے۔ سال گزر گیا ہے روپیہ کے ساتھ سود بھی لگائیے تو چوراسی روپے ہوتے ہیں۔ کل دکان پر آ کر حساب کر جائیے۔ پورا نہیں تو آدھا تہائی کچھ تو دیجیے۔ لین دین جاری رہنے سے مہاجن کی تسلی رہتی ہے۔ کان میں تیل ڈال کر بیٹھے رہنے سے اسے شبہ ہونے لگتا ہے کہ اس کی نیت خراب ہے تو کل کب آئیے گا؟''

رما: ''بھائی کل میں روپے لے کر تو نہ آ سکوں گا۔ یوں جب کہو تب چلا آؤں۔ کیوں اس وقت اپنے سیٹھ جی سے چار پانچ سو کا بندوبست نہ کرا دو گے؟ تمہاری مٹھی بھی گرم کر دوں گا۔''

چرن داس: ''کہاں کی بات لیے پھرتے ہو بابو جی۔ انہوں نے یہی بڑا سلوک کیا کہ نالش نہیں کر دی۔ آپ کے پیچھے مجھے بھی باتیں سننی پڑتی ہیں۔ کیا بڑے منشی جی سے کہنا پڑے گا۔''

رما نے جھلا کر کہا۔ ''تمہارا دین دار میں ہوں۔ بڑے منشی جی نہیں ہیں۔ میں مر نہیں گیا ہوں۔ گھر چھوڑ کر نہیں بھاگا جاتا۔ اتنے بے صبرے کیوں ہوئے جاتے ہو؟''

چرن داس: ''سال بھر ہوا ایک کوڑی تک نہیں ملی۔ کہاں تک صبر کریں۔ کل کم سے کم دو سو روپے کی فکر رکھیے گا۔''

رما: ''میں نے کہہ دیا، میرے پاس ابھی روپے نہیں ہیں۔''

چرن داس: ''یہ روز رقمیں مارتے ہو وہ کہاں جاتی ہیں۔ گھر میں کوئی ایسا لمبا خرچ بھی تو نہیں ہے؟''

رما نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ سائیکل بڑھا دی۔ ادھر آیا تھا کہ شاید نجات کی کوئی صورت نکلے۔ الٹے تقاضا سہنا پڑا۔ کہیں یہ شیطان سچ مچ بابو جی کے پاس تقاضا نہ بھیج دے۔ آگ ہی ہو جائیں گے۔ جالپا بھی سمجھے گی کیسا کباڑیا آدمی ہے۔ اس وقت رما کی آنکھوں سے آنسو نہ نکلے تھے، مگر اس کا رواں رواں رو رہا تھا۔ جالپا سے اپنی اصلی حالت چھپا کر اس نے کتنی بڑی غلطی کی۔ وہ سمجھدار عورت ہے۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ میں اتنا تنگ دست ہوں تو وہ مجھے کبھی زیر بار نہ کرتی۔ اس نے تو کبھی اپنی زبان سے کچھ کہا ہی نہیں۔ میں ہی اپنی شان دکھانے کے لیے مرا جا رہا تھا۔ قرض کا اتنا بھاری بوجھ سر پر رکھ کر بھی اس نے کیوں نہ کنایت سے

کام لیا۔ اسے ایک ایک پیسہ دانتوں سے پکڑنا چاہیے تھا۔

اس دوران میں اس کی آمدنی ایک ہزار سے کم نہ ہوئی ہوگی۔ اگر اس نے جزرسی اختیار کی ہوتی تو ان دونوں مہاجنوں کے آدھے آدھے روپے ضرور ادا ہو جاتے۔

مگر وہاں تو سر پر شیطان سوار تھا۔ اس کی کیا ضرورت تھی کہ جالپا محلّہ بھر کی عورتوں کو جمع کر کے روز سیر کرنے جائے۔

سینکڑوں روپے تو تانگہ والا ہی لے گیا ہوگا۔ پرا سے تو بیوی پر رعب جمانے کی دھن سوار تھی۔ سارا بازار جان جائے کہ الہ نرے لفنگے ہیں، لیکن اپنی رفیق بیوی سے پردہ کیا جائے۔

وہ گھر پہنچا تو جالپا نے پوچھا ''کہاں چلے گئے تھے، بڑی دیر لگا دی؟''

رما: ''تمہارے کارن رتن کے بنگلے پر جانا پڑا۔ تم نے پوری تھیلی اٹھا کر دے دی۔ اس میں دو سو روپے میرے بھی تھے۔''

جالپا: ''تو مجھے کیا معلوم تھا۔ تم نے بتایا بھی تو نہیں، لیکن اس کے پاس سے روپے نہیں جا سکتے۔ آپ ہی بھیج دیں گی۔''

رما: ''مانا مگر سرکاری رقم تو کل داخل کرنی پڑے گی۔''

جالپا: ''مجھ سے دو سو روپے لے لینا، میرے پاس ہیں۔''

رما کو یقین نہ آیا، بولا۔ ''تمہارے پاس اتنے روپے کہاں سے آئے؟''

جالپا: ''تمہیں اس سے کیا مطلب۔ میں تو دو سو دینے کو کہتی ہوں۔''

رما کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ دو سو روپے یہ دے دے۔ دو سو روپے رتن سے مل

جائیں۔ سو روپے اس کے پاس ہیں ہی تو کل تین سو روپے کی کمی رہ جائے گی۔ مگر وہ تین سو روپے کہاں سے آئیں گے۔ ایسا کوئی نظر نہ آتا تھا، جس سے اتنے روپے ملنے کی امید کی جا سکے۔ جب وہ کھانا کھا کر لیٹا تو جالپا نے کہا:

''آج کس سوچ میں پڑے ہو؟''

رما: ''سوچ کس بات کی، کیا میں متفکر ہوں؟''

جالپا: ''ہاں کسی فکر میں پڑے ہوئے ہو۔ مگر مجھ سے چھپا رہے ہو۔''

رما: ''میں نے تو تم سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔''

جالپا: ''واہ، تم اپنے دل کی بات مجھ سے کیوں کہنے لگے۔ رشیوں کا حکم نہیں ہے۔''

رما: ''میں ان رشیوں کا معتقد نہیں ہوں۔''

جالپا: ''وہ تو جب معلوم، جب میں تمہارے دل میں بیٹھ کر دیکھتی۔''

رات کو جالپا نے ایک خوفناک خواب دیکھا اور چلا پڑی۔ رما نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا ہے جالپا۔ کیا خواب دیکھ رہی ہو؟'' جالپا نے ادھر ادھر سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر کہا:

''بڑے عذاب میں جان پڑی تھی۔ بڑا برا خواب دیکھا۔''

رما: ''کیا دیکھا؟''

جالپا: ''کیا بتاؤں، کچھ کہا نہیں جاتا۔ دیکھتی تھی کہ تمہیں کئی سپاہی پکڑے لیے جا رہے ہیں۔ کتنی ڈراؤنی صورت تھی ان کی۔''

رما کا خون خشک ہو گیا۔ دو چار دن قبل اس خواب کو اس نے ہنسی سے اڑا دیا

ہوتا۔ اس وقت اسے خواہ مخواہ ایک تشویش پیدا ہوگئی۔ مگر باہر سے ہنس کر بولا:

''تم نے سپاہیوں سے پوچھا نہیں، انہیں کیوں پکڑے لیے جاتے ہو؟''

جالپا: تمہیں ہنسی سوجھ رہی ہے اور میرا دل کانپ رہا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد رما نے نیند میں بکنا شروع کیا:

''اماں کہے دیتا ہوں، پھر میرا منہ نہ دیکھو گی۔ میں ڈوب مروں گا۔''

جالپا کو ابھی نیند نہ آئی تھی۔ وہ ڈر گئی۔ رما کو زور سے ہلا کر بولی۔ ''مجھے تو ہنستے تھے اور خود بکنے لگے۔ سن کر روئیں کھڑے ہو گئے۔ خواب دیکھتے تھے کیا؟''

رما نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ''ہاں جی، نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا؟ کچھ یاد نہیں!''

جالپا نے پوچھا۔ ''اماں جی کو کیوں دھمکا رہے تھے، سچ بتاؤ کیا دیکھتے تھے؟''

رما نے سر کھجلاتے ہوئے کہا۔ ''کچھ یاد نہیں آتا، یونہی بکنے لگا ہوں گا۔''

جالپا: ''اچھا تو کروٹ سے سونا، چت سونے سے آدمی بکنے لگتا ہے۔''

رما کروٹ سے لیٹ گیا، لیکن اسے معلوم ہوتا تھا گویا فکر اور خوف آنکھوں میں بیٹھے ہوئے نیند کے حملوں سے ان کی حفاظت کر رہے ہیں۔ جاگتے جاگتے دو بج گئے۔ دفعتاً جالپا اٹھ بیٹھی اور صراحی سے پانی انڈیلتی ہوئی بولی ''بڑی پیاس لگی تھی، کیا تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟''

رما: ''ہاں جی! نیند اچٹ گئی ہے۔ میں سوچ رہا تھا تمہارے پاس دو سو روپے کہاں سے آ گئے؟''

جالپا: ''یہ روپے میں اپنے گھر سے لائی تھی۔ کچھ بدائی میں ملے تھے، کچھ منہ دکھائی میں۔''

رما: ''تب تو تم روپے جمع کرنے میں بڑی ہوشیار ہو۔ یہاں کیوں نہیں کچھ جمع کیا؟''

جالپا نے مسکرا کر کہا۔ ''تمہیں پا کر اب روپے کی پروا نہیں رہی۔''

رما: ''اپنی تقدیر کو کوستی ہوگی۔''

جالپا: ''تقدیر کو کیوں کوسوں۔ تقدیر کو وہ روئے، جس کا شوہر نکھٹو ہو، شرابی ہو، بدچلن ہو، طعنوں سے عورت کا دل چھیدتا رہے اور بات بات پر بگڑے۔ آدمی اپنے مرضی کا ہو تو عورت اس کے ساتھ فاقہ کر کے بھی خوش رہے گی۔''

رما نے تمسخر کر کے پوچھا۔ ''تو میں تمہارے من کا ہوں؟''

جالپا نے محبت آمیز غرور سے کہا۔ ''میری جو امید تھی، اس سے تم کہیں بڑھ کر نکلے۔ میری تین سہیلیاں ہیں۔ مگر ایک کا شوہر بھی تم جیسا نہیں۔ ایک ایم۔ اے پاس ہے مگر دائم المریض، دوسرا تعلیم یافتہ بھی اور مالدار بھی، مگر عیاش۔ تیسرا بالکل نکھٹو ہے۔''

رما غمگین ہو گیا۔ ایسی وفادار اور خلوص کی دیوی کے ساتھ اس نے کتنا دغا کیا۔ جب اتنا پردہ رکھنے پر بھی جالپا کو اس پر اتنا اعتماد ہے، تو ان ظاہرداریوں کو مٹا کر اس کی زندگی کتنی پر عاقبت تھی۔

(19)

علی الصبح رما نے رتن کے پاس اپنا آدمی بھیجا۔

خط میں لکھا تھا۔ ''مجھے بڑا افسوس ہے کہ کل جالپا نے آپ کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جو اسے لازم نہ تھا۔ میری منشا ہرگز نہ تھی کہ آپ کو روپے واپس کر دوں۔ میں

نے صراف کو تنبیہ کرنے کے لیے اس سے روپے لے لیے تھے۔ کنگن دو چار روز میں ضرور مل جائیں گے۔ آپ روپے بھیج دیں۔ اس تھیلی میں دوسو روپے میرے بھی تھے۔ اس کا خیال رکھیے گا۔''

غرض اپنی خودداری کا لحاظ رکھتے ہوئے جتنا انکسار ممکن تھا، وہ اس نے ظاہر کیا۔ جب تک آدمی لوٹ کر نہ آیا۔ وہ بڑی بےصبری سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ سوچ رہا تھا کہیں بہانہ ہی نہ کر دے یا گھر پر ملے ہی نہیں یا دو چار دن بعد دینے کا وعدہ کرے۔ سارا دارومدار رتن کے روپوں پر تھا۔ اگر اس نے صاف جواب دے دیا تو پھر خدا ہی حافظ ہے۔

اس کے انکار کا خیال کر کے ہی اس کی روح فنا ہو رہی تھی۔ آخر نو بجے آدمی لوٹا۔ رتن نے دوسو روپے تو دے دیئے تھے مگر خط کا جواب نہ دیا تھا۔

رما نے مایوس آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ سوچنے لگا، رتن نے خط کا جواب کیوں نہیں دیا، کیا اتنی کج خلق ہے؟ کتنی مکار عورت ہے۔ رات کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شرافت اور اخلاق کی پتلی ہے۔ مگر دل میں یہ غبار بھرا ہوا تھا۔

باقی روپوؤں کی فکر میں رما کو نہانے اور کھانے کی بھی یاد نہ رہی۔

کہار اندر گیا تو جالپا نے پوچھا۔ ''تمہیں کچھ دھندے کی بھی فکر ہے کہ مٹر گشتی ہی کرتے رہو گے۔ دس بج رہے ہیں اور ابھی تلک ساگ بھاجی کا کہیں پتا نہیں۔''

کہار نے تیوریاں بدل کر کہا۔ ''تو کیا چار ہاتھ پیر کر لوں۔ کام ہی سے تو گیا تھا۔ بابو نے میم صاحب کے پاس روپیہ لینے کو بھیجا تھا۔''

جالپا: ''میم صاحب کون؟''

کہار: ''وہی جو موٹر پر چڑھ کر آتی ہیں۔''

جالپا: ''تو لائے روپے؟''

کہار: ''لایا کیوں نہیں۔ سو کوس پر تو رہتی ہیں۔ دوڑتے دوڑتے پاؤں ٹوٹ گئے۔''

جالپا: ''اچھا جھٹ پٹ جا کر ترکاری لاؤ۔''

کہار تو ادھر گیا۔ رما روپے لیے ہوئے اندر پہنچا تو جالپا نے پوچھا:

''تم نے اپنے روپے رتن سے منگوا لیے نا۔ اب تو مجھ سے نہ لوگے؟''

رما نے مایوسانہ انداز سے کہا: ''مت دو۔''

جالپا: ''میں نے کہہ دیا تھا کہ روپے دے دوں گی، پھر آدمی کیوں دوڑایا۔ سمجھی ہوں گی انہیں میرا اتنا اعتبار بھی نہیں۔''

رما: ''میں نے روپے نہیں مانگے تھے، صرف اتنا لکھ دیا تھا کہ تھیلی میں دو سو روپے زیادہ ہیں۔''

جالپا ہنس کر بولی ''میرے روپے بڑے بھاگوان ہیں۔ دکھاؤں، چن چن کر نئے روپے رکھے ہیں۔ سب چما چم، دیکھو تو آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔''

یکا یک کسی نے نیچے سے آواز دی۔ ''بابو جی سیٹھ نے روپے کے لیے بھیجا ہے۔''

منشی دیا ناتھ کسی کام سے اندر آ رہے تھے۔ سیٹھ کے پیادے کو دیکھ کر پوچھا۔

''کون سیٹھ؟ کیسے روپے؟ میرے یہاں کسی کے روپے نہیں آتے۔''

پیادہ بولا۔ ''چھوٹے بابو نے کچھ مال لیا تھا۔ سال بھر ہو گیا۔ ابھی تک ایک پیسہ نہیں دیا۔ سیٹھ جی نے کہا ہے۔ بات بگڑنے پر دیئے تو کیا دیئے۔ آج کچھ ضرور دلوا دیجیے۔''

دیانا تھ نے رما کو پکارا اور بولے ''دیکھو کس سیٹھ کا آدمی آیا ہے۔ اس کا کچھ حساب باقی ہے۔ صاف کیوں نہیں کر دیتے، کتنا باقی ہے؟''

رما کچھ جواب نہ دے پایا تھا کہ پیادہ بول اٹھا۔ ''پورے سات سو بابو جی؟''

منشی دیانا تھ کی آنکھیں پھیل کر پیشانی تک جا پہنچیں۔ ''سات سو کیوں جی۔ یہ تو سات سو کہتا ہے؟''

رما نے ٹالنے کے ارادے سے کہا۔ ''مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں۔''

پیادہ: ''معلوم نہیں، پرزہ تو میرے پاس ہے۔ تب سے کچھ دیا ہی نہیں، کم کہاں سے ہو گئے۔''

رما: ''تم چلو دکان پر، میں خود آتا ہوں۔''

پیادہ: ''ہم بغیر روپے لیے نہ جائیں گے صاحب! آپ یونہی ٹال دیا کرتے ہیں اور باتیں ہم کو سننی پڑتی ہیں۔''

رما کو ساری دنیا کے سامنے ذلیل ہونا گوارا تھا، لیکن باپ کے سامنے اس طرح کی ذلت اس کے لیے موت سے کم نہ تھی۔ جس آدمی نے اپنی زندگی میں کبھی حرام کا ایک پیسہ نہ چھوا ہو، جس نے قرض لے کر کھانے کے بدلے بھوکوں سو رہنا منظور کیا ہو، اس کا لڑکا اتنا بے شرم اور بے غیرت ہو۔

رما اپنے والد کی روح کو اور زیادہ صدمہ نہ پہنچا سکتا تھا۔ تند لہجے میں پیادہ سے

بولا:

''تم ابھی یہیں کھڑے ہو، ہٹ جاؤ نہیں تو دھکے دے کر نکال دیئے جاؤ گے۔''

پیادہ: ''ہمارے روپے دلوایئے، ہم چلے جائیں۔ ہمیں آپ کے دروازے سے کیا مٹھائی ملتی ہے؟''

رما: ''جا کر الہ سے کہہ دو، نالش کر دیں۔''

منشی دیانا تھ نے ڈانٹ کر کہا۔ ''کیا بے شرمی کی باتیں کرتے ہو جی۔ جب گرہ میں روپے نہ تھے تو چیز لائے ہی کیوں؟ اور جب لائے تب ادا کرو۔ کہہ دیا نالش کر دو۔ نالش کر دے گا تو کیا آبرو رہ جائے گی تمہاری اور تمہیں یہ سوجھی کیا کہ اتنا بڑا بوجھ سر پر لا دلیا۔ کوئی شادی بیاہ کا موقع ہوتا تو ایک بات بھی تھی۔ یہ عورت کیسی ہے، جو شوہر کو ایسی بے ہودگی کرتے دیکھتی ہے اور منع نہیں کرتی۔''

رما کو یہ تنبیہ ہی بری معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے خیال میں منشی جی کو اس معاملے میں بولنے کا حق نہ تھا۔ گستاخی سے بولا۔ ''آپ ناحق اتنا بگڑ رہے ہو، آپ سے روپے مانگنے جاؤں تو کہیے گا۔''

اپنے دل میں اس نے کہا۔ ''ذلت آپ ہی کی بدولت ہو رہی ہے۔ آپ ہی کی کرنی کا پھل بھوگ رہا ہوں۔''

پیادے نے باپ بیٹے میں تکرار ہوتی دیکھی تو چپکے سے راہ لی۔ منشی جی بھنبھناتے ہوئے نہانے چلے گئے۔ رما اوپر گیا تو چہرے پر خفت چھائی ہوئی تھی۔ جس بے عزتی سے بچنے کے لیے وہ ڈال ڈال پات پات بھاگتا پھرتا تھا، وہ آج

ہو ہی گئی۔ اس ذلت کے سامنے سرکاری روپوؤں کی فکر بھی غائب ہو گئی۔ رما ابھی عام قرض خوروں کی طرح بے غیرت نہیں ہوا تھا۔ اگر موت کا فرشتہ اس کی جان لینے آتا تو وہ دوڑ کر اس کا خیر مقدم کرتا۔

جالپا نے پوچھا۔ ''تم نے کہا تھا، اس کے اب تھوڑے ہی روپے باقی ہیں۔''

رما نے سر جھکا کر کہا۔ ''بدمعاش جھوٹ بول رہا تھا؟''

جالپا: ''دیئے ہوتے تو کیوں روپوؤں کا تقاضا کرتا؟ جب تمہاری آمدنی اتنی کم تھی تو گہنے لیے ہی کیوں؟ میں نے کبھی ضد نہ کی تھی اور مان لو میں ضد بھی کرتی تو تمہیں سمجھ بوجھ کر کام کرنا تھا۔ اپنے ساتھ مجھے بھی چار گالی سنوا دیں۔ آدمی ساری دنیا سے پردہ رکھتا ہے، لیکن اپنی بیوی سے تو پردہ نہیں رکھتا۔ اگر میں جانتی کہ تمہاری آمدنی اتنی تھوڑی ہے تو مجھے کیا کتے نے کاٹا تھا کہ سارے محلے کی عورتوں کو تانگے میں بٹھا بٹھا کر سیر کرانے لے جاتی۔ کہیں نالش کر دے تو سات سو کے ایک ہزار ہو جائیں۔ مجھے نہ معلوم تھا کہ تم مجھ سے یہ فریب کر رہے ہو۔ کوئی بازاری عورت تو تھی نہیں کہ تمہیں نوچ کھسوٹ کر اپنا گھر بھر لیتی۔ میں تو بھلے برے دونوں ہی کی ساتھن ہوں۔ بھلے میں تم چاہے میری بات نہ پوچھو، لیکن برے میں تو تمہارے گلے پڑوں گی ہی۔''

رما کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ دفتر کا وقت آ گیا تھا۔ کھانا کھانے کی مہلت نہ تھی۔ کپڑے پہنے اور دفتر چلا۔ ابھی گھر سے نکلا ہی چاہتا تھا کہ جالپا لپک کر نیچے آئی اور بولی:

''میرے پاس جو دو سو روپے ہیں، وہ کیوں نہیں صراف کو دے دیتے؟''

رما نے چلتے وقت عمداً جالپا سے روپے نہ مانگے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ جالپا مانگتے ہی دے دے گی، لیکن باتیں سننے کے بعد روپے کے لیے اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے اسے شرم آتی تھی۔ جالپا کی آواز سن کر ٹھٹھک گیا اور بولا:

''اچھی بات ہے، لاؤ دے دو۔''

وہ باہر کے کمرے میں بیٹھ گیا۔ جالپا دوڑ کر اوپر سے روپے لائی اور گن گن کر اس کی تھیلی میں ڈال دیئے۔ اس نے سمجھا تھا، رما روپے پا کر پھولا نہ سمائے گا، مگر اس کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی، اسے ابھی تین سو روپوؤں کی فکر اور کرنی تھی۔ وہ کہاں سے آئیں گے۔

سڑک پر آ کر رما نے ایک تانگہ لیا اور رتن کے بنگلے پر جا پہنچا۔ شاید رتن سے ملاقات ہو جائے۔ وہ چاہے تو تین سو روپوؤں کا بڑی آسانی سے انتظام کر سکتی ہے۔ راستے میں وہ سوچتا جاتا تھا کہ آج ذرا بھی تکلف نہ کروں گا۔ ذرا دیر میں رتن کا بنگلہ آ گیا۔ وہ سامنے ہی برآمدہ میں بیٹھی تھی۔ رما نے اسے دیکھ کر ہاتھ اٹھایا۔ اس نے بھی ہاتھ اٹھایا۔ تانگہ سامنے سے نکل گیا۔ وہ بنگلہ کے اندر نہ جا سکا۔ رتن بلاتی تو وہ چلا جاتا۔ وہ برآمدے میں نہ بیٹھی ہوتی تب بھی شاید وہ اندر چلا جاتا، لیکن اسے بیٹھی دیکھ کر وہ محجوب ہو گیا۔

جب تانگہ اور آگے پہنچا تو رما نے اسے چنگی کے دفتر چلنے کو کہا اور گیارہ بجتے بجتے وہاں جا پہنچا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ چھاتی دھڑک رہی تھی۔ رمیش بابو نے اس کو ضرور پوچھا ہو گا، جاتے ہی بلائیں گے۔ دفتر کے کاموں میں وہ ذرا بھی رعایت نہیں کرتے۔ تانگہ سے اترتے ہی اس نے پہلے اپنے کمرے کی طرف نگاہ

ڈالی۔ دیکھا کئی آدمی اس کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ وہ ادھر نہ جا کر رمیش بابو کے یہاں پہنچا۔ یہ انتشار اب اس کی برداشت سے باہر تھا۔

رمیش بابو نے پوچھا ''تم اب تک کہاں تھے جی! خزانچی صاحب تمہیں تلاش کرتے پھرتے ہیں، چپڑاسی ملا تھا؟''

رما نے اٹک اٹک کر کہا۔ ''میں گھر پر نہ تھا، ذرا وکیل صاحب کی طرف چلا گیا تھا۔ ایک بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔''

رمیش: ''کیسی مصیبت، گھر میں تو خیریت ہے؟''

رما: ''جی ہاں خیر و عافیت تو ہے، کل شام کو یہاں کام بہت تھا۔ میں اس میں ایسا پھنسا کہ وقت کی یاد نہ رہی۔ جب کام ختم کر کے اٹھا تو خزانچی صاحب چلے گئے تھے۔ میرے پاس آمدنی کے آٹھ سو روپے تھے۔ سوچنے لگا اسے کہاں رکھوں گا۔ میرے کمرے میں کوئی صندوق تو ہے نہیں۔ یہی فیصلہ کیا کہ ساتھ لیتا جاؤں۔ پانچ سو روپے نقد تھے۔ وہ تو میں نے تھیلی میں رکھے، تیس سو روپے کے نوٹ جیب میں رکھ لیے اور گھر چلا۔ چوک میں دو ایک چیزیں لینی تھیں، ادھر سے ہوتا ہوا گھر پہنچا تو نوٹ غائب تھے۔''

رمیش نے آنکھیں پھاڑ کر کہا ''تیس سو روپے کے نوٹ غائب ہو گئے؟''

رما: ''جی ہاں! کوٹ کے اوپر کی جیب میں تھے۔ کسی نے نکال لیے۔''

رمیش: ''اور تم کو مار کر تھیلی نہیں چھین لی؟''

رما: ''کیا بتاؤں بابو جی! تب سے ایسے خلجان میں پڑا ہوں کہ کچھ نہیں سوجھتا۔ صبح سے اسی فکر میں دوڑ رہا ہوں لیکن کوئی بندوبست نہ ہو سکا۔''

رمیش: ''منشی جی سے تو تم نے کہا ہی نہ ہوگا؟''

رما: ''ان کی عادت سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ روپے تو کیا دیتے، الٹی ڈانٹ سناتے۔''

رمیش: ''تو پھر کیا کرو گے؟''

رما: ''آج شام تک مہلت دیجیے، کچھ نہ کچھ کروں گا ہی۔''

رمیش نے ترش ہو کر کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا تم سے اتنی اا پروائی کیوں ہوئی۔ میری جیب سے تو آج تک ایک پیسہ بھی گرا۔ آنکھیں بند کر لی تھیں یا نشہ میں تھے۔ مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں آتا۔ سچ سچ بتلا دو کہیں انا پ شناپ تو نہیں خرچ کر ڈالے۔ اس دن تم نے مجھ سے روپے کیوں مانگے تھے؟''

رما کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ رمیش کا قیاس اصلیت کے بہت قریب جا پہنچا تھا، بولا:

''کیا سرکاری روپے خرچ کر ڈالوں گا۔ اس دن آپ سے روپے اس لیے مانگے تھے کہ بابو جی کو ایک ضرورت آن پڑی تھی۔ میں نے آپ کا خط انہیں سنا دیا۔ بہت ہنسے۔ نوٹوں کے غائب ہونے کا تو مجھے خود ہی تعجب ہے۔''

رمیش: ''تمہیں منشی جی سے مانگتے شرم آتی ہو تو میں لکھ کر منگوا لوں؟''

رما نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''اس سے کہیں بہتر ہے، آپ مجھے گولی مار دیں۔''

رمیش نے ذرا تامل کر کے کہا۔ ''تمہیں یقین ہے، شام تک روپے مل جائیں گے؟''

رما: ''جی ہاں امید تو ہے۔''

رمیش: ''پھر یہ پانچ سو روپے جمع کر دو، مگر دیکھو بھائی میں صاف صاف کہہ دیتا ہوں، اگر کل دس بجے تک روپے نہ لائے تو مجھے الزام نہ دینا۔ قاعدہ تو یہی کہتا ہے کہ میں اسی وقت تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں، لیکن تم ابھی لڑکے ہو اس لیے رعایت کرتا ہوں، ورنہ تمہیں معلوم ہے کہ میں سرکاری کاموں میں کسی قسم کی رعایت نہیں کرتا۔ تمہاری جگہ اگر میرا لڑکا یا بھائی بھی ہوتا تو میں اس کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کرتا، بلکہ شاید اس سے بھی سخت۔ میرے پاس روپے ہوتے تو تمہیں دے دیتا، لیکن میری عادت تو جانتے ہو، نہ کسی کو قرض دیتا ہوں، نہ کسی سے لیتا ہوں۔ کل روپے نہ آئے تو برا ہوگا۔ میری دوستی بھی تمہیں پولیس کے پنجے سے نہ بچا سکے گی۔ میری دوستی نے تو آج اپنا حق ادا کر دیا، ورنہ اس وقت تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہوتیں۔''

''ہتھکڑیاں؟'' رما سر سے پیر تک کانپ اٹھا۔ اس ذلت اور رسوائی کا خیال کر کے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ سزا یافتہ قیدی کی طرح اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مگر وہ لفظ رہ رہ کر اس کے دل کو مسوس لیتا تھا۔

(20)

رما شام کو دفتر سے چلنے لگا تو رمیش بابو دوڑے ہوئے آئے اور کل روپے لانے کی سخت تاکید کی۔ رما دل میں جھنجھلا اٹھا۔ آپ بڑے ایماندار کی دم بنے ہیں۔ مکار کہیں کا۔ اگر اپنی ضرورت آ پڑے تو دوسروں کے تلوے سہلاتے پھریں گے، مگر میرا کام ہے تو آپ اصول پرور بن بیٹھے۔ یہ سب دکھانے کے دانت ہیں۔ مرنے کے وقت اس کی جان بھی جلد نہ نکلے گی۔